QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678

Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

غلام عباس کے افسانہ "اوورکوٹ" کا نفسیاتی تجزیہ

PSYCHOLOGICAL ANALYSIS OF THE SHORT STORY "OVERCOAT" BY GHULAM ABBAS

Muhammad Arshad Nadeem
Scholar M.Phil. Urdu,University of Southern Punjab Multan
Khalid Mahmood
Scholar M.Phil. Urdu,University of Southern Punjab Multan
Nazia Ansari Corresponding Author
Lecturer Urdu,University of Southern Punjab Multan
nazia@usp.edu.pk

Abstract

In Urdu short fiction, the contribution of Ghulam Abbas holds remarkable significance, to the extent that his work may confidently be included even in the most selective anthologies of Urdu literature. He stands alongside eminent short story writers such as Premchand, Saadat Hassan Manto, and Rajinder Singh Bedi in terms of literary stature and artistic excellence. Although Ghulam Abbas produced a relatively limited body of work, he consistently preserved the artistic quality and intellectual depth of his fiction across different periods. He possessed a profound understanding of the craft of the afsana (short story), which is evident in celebrated works such as "Hamsaaye," "Juwaari," "Naak Kaatne Waale", "Barda Farosh," and "Fancy Hair Cutting Salon." These stories have exerted an enduring influence rather than a merely temporary impact. Instead of relying on popular literary techniques to attain immediate fame, Abbas sought to elevate readers to the aesthetic and intellectual level of his art. Consequently, the influence of his stories has continued to transcend generations, further consolidating his literary reputation over time.

Ghulam Abbas attempted to capture the broader collective experience of human life in his fiction. His stories do not revolve around a single dominant protagonist; rather, they explore the deeper dimensions of life through the actions, interactions, and experiences of multiple characters. He establishes a distinct thematic framework for each narrative and develops the entire artistic progression of the story within that conceptual sphere.

In stories such as "Katba" and "Overcoat," Abbas depicts the harsh realities of poverty and social deprivation. However, his fiction avoids overt propaganda and direct moralization. Instead, he presents nuanced reflections of human existence through subtle artistic representation. His narratives offer profound psychological insights into human desires, emotions, and behavioral complexities.

Keywords: Classic, Ridiculous, Realism, Observations, Social Deprivation

غلام عباس اردو ادب کے وہ افسانہ نگار ہیں جو اپنی زندگی میں ہی کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ ان کا مزاج دھیما تھا۔ اور یہی دھیما پن ان کے افسانوں کا خاصا ہے ۔غلام عباس نے مسائل پر مبنی افسانے نہیں لکھے بلکہ انھوں نے انسانوں کے قصے لکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے وقت کے ساتھ اپنی دلچسپی کھونے کی بجائے اسی طرح تروتازہ زندہ رہتے ہیں۔ اگر موضوعاتی حوالے سے غلام عباس کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک زندگی فریب اور طنز ہے۔ اور یہی طنزو فریب ان کے افسانوں کا خاصا ہے۔ غلام عباس کے افسانوں میں حقیقت نگاری اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ موجود ہے۔ مگر انھوں نے حقیقت نگاری کو ان تجربات اور مشاہدات کی صورت میں پیش کیا ہے جو ایک عام آدمی نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس کا سامنا بھی کرتا ہے۔ غلام عباس کی تصانیف درج ذیل ہیں:

"الحمرا کے افسانے"(1931ء) ،"گوندنی والا تکیہ(1936ء)،"ننھی کی گڑیا(1936ء)،"چار چھوٹے ناٹک"(1936ء)"جزیرہ سخن وراں"(1941ء)"آنندی"(1948ء)"جاڑے کی چاندنی"(1960ء)"کن رس"(1969ء)"دھنک"(1969ء) "رینگنے والے"(1980ء)"چاند تارا" (نظمیں)"جلا وطن" (ترجمہ ازلیوٹالسٹائی)"بے چارہ سپاہی" اس کے علاوہ صدر ایوب کی کتاب "فرینڈ ناٹ ماسٹرز" کا ترجمہ،"جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ 1924ء سے 1982ء تک غلام عباس نے اردو ادب کو چار افسانوی مجموعوں، تین ناولٹ، تراجم، بچوں کا ادب جیسی شاہ کار تخلیقات دی۔

اردو افسانے میں غلام عباس کا نام اتنا اہم ہے کہ انھیں افسانے کے کڑے سے کڑے انتخاب میں بلا خوف و خطر شریک کیا جا سکتا ہے غلام عباس اردو کے ایک بے حد وقیع افسانہ نگار ہیں جنھوں نے بہت تھوڑا لکھا لیکن ہر دور میں اپنے فن کی عظمت کو برقرار رکھا۔ وہ کہانی کو افسانے کے انداز میں بیان کرنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ چنانچہ "ہمسائے"، "جواری"، "ناک کاٹنے والے"، "بردہ فروش"، "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" وغیرہ ان کے چند ایسے افسانے ہیں جن کا اثر لمحاتی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ انہوں نے مقبولیت کے حربے اختیار کرنے کی بجائے قاری کو اپنے فن کی سطح پر اٹھانے کی کوشش کی ہے، اس لیے ان کے افسانوں کا تاثر ایک نسل سے دوسری نسل کو بتدریج منتقل ہوتا ہے جس سے ان کی شہرت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے زندگی کے وسیع تر اجتماعی احساس کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے اور شخصی زاویے سے ان کا افسانہ کسی ایک کردار کو دائرہ نور میں نہیں لاتا بلکہ وہ زندگی کی معنوی وسعتوں کو سمیٹتا اور اسے متعدد کرداروں کی حرکات و سکنات اور اعمال و افعال سے روشنی عطا کرتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا ایک مخصوص مدار بناتے ہیں اور پھر تمام تر تخلیقی سفر اسی مدار میں طے کرتے ہیں۔ ان کے افسانے "کتبہ" اور "اوور کوٹ" میں غربت کے ستائے ہوئے لوگوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں پروپیگنڈا نہیں کرتے اور نہ براہ راست واعظ کرنے لگتے ہیں۔ وہ عموماً انسانی زندگی کے کسی پہلو کی عکاسی کر دیتے ہیں۔ وہ انسانی خواہشات اور جذبات کی نفسیاتی تصویر کشی کرتے ہیں۔ افسانہ "ہمسائے" میں بچوں کی تمناؤں کو موضوع بنایا گیا ہے افسانوں کے ذریعے کوئی اخلاقی سبق دینا ان کا مقصد نہیں بلکہ قاری پر حالات و واقعات آشکار کرنا ہوتا ہے۔ "ناک کاٹنے والے"، "اندھیرے میں"، "سمجھوتے" اور "آنندی" سب میں یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بقول سویا مانے یاسر:

> "عام انسانوں کی بے بسی کا ذکر ہی غلام عباس کے افسانوں کا ایک اہم موضوع قرار دیا جا سکتا ہے۔"(1)

ان کے افسانوں کا انجام اکثر المیاتی احساس پیدا کرتا ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد قاری پر ایک ہلکی سی افسردگی طاری ہو جاتی ہے مگر یہ افسردگی قاری پر کسی نہ کسی حقیقت کا انکشاف بھی کرتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر حقیقت نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں جذباتیت نہیں پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں ہیجان اور توڑ پھوڑ کی بجائے ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ کہانی لکھتے ہوئے اور انسانی فطرت کو نہایت اطمینان و سکون سے بے نقاب کرتے چلے جاتے ہیں۔ "آنندی"، "جاڑے کی چاندنی" اور "کن رس" کے تمام افسانوں میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنے گردوپیش میں جو کچھ دیکھا اسے اپنے افسانوں میں نہایت خلوص اور چابکدستی کے ساتھ پیش کیا۔ غلام عباس صحیح معنوں میں مختصر افسانہ نویس تھے اور انہیں یہ فن بدرجہ اتم آتا تھا۔ وہ کفایت لفظی کے قائل تھے۔ ان کے افسانوں میں ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کرتے جس کا افسانے کی بنت سے تعلق نہ ہو۔ اس لیے ان کے افسانوں میں گہرا تاثر پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید "مختصر اردو افسانہ عہد بہ عہد" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> "فنی اعتبار سے غلام عباس زندگی کی ایک چھوٹی سی قاش کو موضوع بنانے کے بجائے زندگی کے وسیع تر اجتماعی احساس کو افسانے میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا افسانی کسی ایک مخصوص کردار کو دائرہ فن میں نہیں لاتا بلکہ وہ زندگی کی معنوی وسعتوں کو سمیٹنے اور متعدد کرداروں کو ان کے اعمال و افعال کی روشنی میں منظر پر ابھار دیتے ہیں۔"(2)

ان کے افسانوں کے واقعات بعض اوقات تو سادہ ہی نہیں بے رنگ بھی نظر آتے ہیں لیکن جب افسانہ ختم ہوتا ہے تو یہ بے رنگ واقعات مجموعی تاثر کی تشکیل میں اہمیت کے حامل بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ افسانے کے آہنگ اور تسلسل کو برقرار رکھتے ہے۔ غلام عباس نے 1924ء تا 1925ء سے افسانہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا پہلا طبع زاد افسانہ "مجسمہ" 1939ء میں اس دور کے معروف ادبی مجلے "کارواں" لاہور میں شائع ہوا۔ اس وقت پریم چند ترقی پسند تحریک اور سجاد حیدر یلدرم رومانوی تحریک کے زیر اثر اپنے افسانوں سے اردو ادب میں نام روشن کر رہے تھے لیکن غلام عباس نے رومانیت اور مثالیت سے الگ رہ کر حقیقت نگاری کے رجحان کو اختیار کیا۔ ڈاکٹر انوار احمد کے نزدیک:

> "غلام عباس اردو کے واحد ایسے بڑے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے خود کو کسی ادبی تحریک، رویے یا گروہ سے وابستہ نہیں کیا، پبلک ریلیشننگ کے جتن نہیں کیے، سنسنی نہیں

> پھیلائی، ذاتی زندگی کی محرومیوں اور آرزدگیوں کی نمائش نہیں کی، اس کے باوجود برصغیر پاک وہند میں قارئین کا بے حد وسیع حلقہ انھیں میسر آیا۔ اردو افسانے کے نقاد نے کئی برس غلام عباس کو نظر انداز کیا مگر "آنندی"، "اوورکوٹ"، "کتبہ"، "فینسی ہیئر کٹنگ سیلون" اور "جوار بھاٹا" کو افسانے کی تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔"(3)

غلام عباس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے جس موضوع پر بھی لکھتے رہے۔ اسے تخلیقی انداز میں اس طرح پیش کرتے رہے کہ اس میں فنی حسن پیدا ہو جاتا تھا جس کے باعث اس کی تازگی ختم نہیں ہوتی تھی۔ ان کا خیر وشر کا اپنا ہی تصور ہے جو مذہبی تصور سے مختلف ہے ان کو معلوم ہے کہ دنیا اور معاشرے سے شر کو مکمل طور پر ختم کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ شر انسان کی سرشت میں شامل ہے۔

ان کے افسانوں کی ایک بڑی صفت طنز ہے۔ یہ صفت ان کے بیشتر افسانوں میں موجود ہے جن میں "آنندی"، "اوورکوٹ"، "بھنور"، "بامے والا"، "بردہ فروش"، "پری چہرہ لوگ"، "لچک"، "جوار بھاٹا" اور "رینگنے والے" شامل ہیں۔ غلام عباس کے افسانوں کے کردار عام لوگ ہوتے ہیں۔ ہماری اور آپ کی زندگی کے جیتے جاگتے کردار جن کا تعلق متوسط طبقے سے بھی ہے اور محنت کش طبقے سے بھی کلرک، خوانچہ فروش، مہترانی، موسیقار، مولوی اور بے روزگار وغیرہ۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ان کرداروں کی زندگی اور ان کے دکھ سکھ کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادگی ہے۔ ان کے افسانوں میں نہ صرف یہ کہ پلاٹ واضح ہوتا ہے بلکہ انداز بیان بھی سادہ ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں عبارت آرائی نظر نہیں آتی ان کے ہاں افسانے کے اختتام میں افسانے کی معنویت پوشیدہ ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے۔

غلام عباس کے جن افسانوں نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ وہ افسانے اردو ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے۔ "اوورکوٹ" افسانہ اردو ادب کے شاہکار افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ غلام عباس کا یہ افسانہ ادبی اور عوامی حلقوں میں خاصی مقبولیت کا حامل ہے۔ یہ افسانہ تخلیق کار کی غیر معمولی فنی مہارت، حقیقت نگاری اور فکر کا حسین امتزاج ہے۔ اس افسانے میں غلام عباس نے ظاہری شان وشوکت، سماج کے دوہرے معیار اور مصنوعی پن کے پس پردہ، زندگی کی بے ثباتی اور انسانی محرومیوں کو آشکار کیا ہے۔ یہ افسانہ ان کی فنی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ" میں لکھتے ہیں:

> "آنندی" کے علاوہ غلام عباس کے جس افسانے کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے وہ "اوورکوٹ" ہے۔ افسانے کی تمام فنی خوبیاں ہی نہیں، زندگی سے متعلق ہر طرح کی بصیرت بھی اس افسانے میں سمٹ آئی ہے۔ "اوورکوٹ" بظاہر ایک سیدھا سادہ، بیانیہ افسانہ ہے مگر غور سے دیکھیں تو "اوورکوٹ" علامت ہے ہمارے سماجی بہروپ کی یا خول کی، ایسا خول اور مصنوعی چہرہ جو منافقت کے کھیل کی شرط اول ہے۔ ہم ایک دوسرے کو انھی مصنوعی چہروں، پوشاکوں اور حوالوں سے جاننے اور پہچاننے کے عادی ہو گئے ہیں۔"(4)

افسانہ "اوورکوٹ" پر ژونگ کی پہلی آرکی ٹائپ "Persona" کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ آرکی ٹائپ جو ہم صدیوں سے دیکھتے اور سنتے آ رہے ہیں۔ "با ادب بانصیب" محاورہ ہمارا آزمودہ ہے۔ "Persona" سے مراد ماسک لے سکتے ہیں یہ ہمارا پبلک فیس یعنی دوہرا معیار ہے۔ جو ہم نے اپنے اجتماعی لاشعور سے لیا ہے۔

افسانہ "اوورکوٹ" ژونگ کے اسی "Persona" کا نمونہ ہے "اوورکوٹ" کا کردار بھی ماسک پہنے ہوئے ہے اس کردار کے ظاہر اور باطن میں تضاد ہے۔ یہ افسانہ سماج کے دورخ دکھاتا ہے۔ غلام عباس جب کہانی کا آغاز کرتے ہیں تو وہ سماج کی ایک پرت قاری کے سامنے کھولتے ہیں۔ اور جب اس کا اختتام کیا تو معاشرے کی دوسری پرت کھولی اور یہی ہمارے سماج کا اصل چہرہ ہے۔ افسانہ کے آغاز میں غلام عباس نے قاری کو جو منظر دکھایا ہے وہ ہمارا Public face ہے۔ بعض اوقات ہم دو زندگیاں ایک ساتھ جی رہے ہوتے ہیں۔ ایک وہ زندگی جو اپنے لیے جیتے ہیں اور دوسری وہ جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ دوسری قسم کی زندگی جینا خاصا مشکل ہے۔ مگر اکثر اوقات اپنے عہد کے سماجی رویوں کو سامنے رکھتے ہوئے وہ امور بھی انجام دینے پڑتے ہیں جو انسانی شخصیت کا حصہ نہیں ہوتے۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

اس افسانے میں مرکزی کردار اسی اذیت سے گزرتا ہے۔ جو روپ اس نے خوشی سے یا مجبوری کے تحت اپنایا ہے۔ وہ حقیقی نہیں۔ نوجوان شام کے وقت مال روڈ پر خراماں خراماں چلتا جا رہا ہے اس کی وضع قطع اپنے عہد کے بابو لوگوں جیسی ہے۔ سر پر فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے رکھی ہوئی ہے ہاتھ میں بید کی چھڑی ہے۔ یہ سارا ظاہری حلیہ اس کی اصل حقیقت نہیں ہے۔ بعض اوقات ہم یہ پبلک فیس اس لیے اپناتے ہیں کہ سماج کے دوہرے معیار کو قائم رکھ سکیں۔ اور بسا اوقات دلی تسکین کے لئے بھی اپناتے ہیں۔ اپنی حقیقت چھپانے کے لئے جب ہم دوسرا روپ دھارتے ہیں تو ایک طرح کے احساس کمتری سے باہر نکل آتے ہیں۔ اسی دوہرے معیار کی "اوور کوٹ" میں عکاسی کی گئی ہے۔ نوجوان کا بانک پن دائیں بائیں کے افراد کو متاثر کرتا ہے تبھی تو کبھی پان والا تو کبھی تانگے والا بھی گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہے۔ ہوٹلوں میں انگریزی دھن اور مال روڈ پر مصروفیت سب برصغیر میں نئی تہذیبی لہر کی جھلک ہے۔ بلاشبہ وہ لہر جو انگریز اقتدار کے ساتھ ساتھ اہل مشرق پر وارد ہوئی۔ اس نئی تہذیب نے برصغیر کے مرد و زن کو بے حد متاثر کیا اور ہر خاص و عام کے دل میں اس تہذیب کی ایسی چھاپ بیٹھا دی کہ آج 78 برس گزر جانے کے بعد بھی نوجوان نسل اور ہماری تہذیب اُسی مقام پر ساکت ہے بلکہ انحطاط و تنزل کے اس دلدل میں دھنستی ہی چلی جا رہی ہے۔ بلاشبہ مصنف نے بھی اسی تہذیبی تغیر سے متاثرہ نوجوان کی تصویر کشی کی ہے اور "اوور کوٹ" کی کہانی کو بے شمار سماجی و تہذیبی علامتوں سے مزین کر دیا ہے۔

نوجوان اپنے بہروپ سے دوسروں کو دھوکہ دینے میں کسی حد تک کامیاب رہتا ہے۔ صرف لباس ہی نہیں زبان بھی انگریزی استعمال کرنا اس کی ضرورت اور خواہش ہے کیوں کہ وہ نہ صرف دولت بلکہ عزت اور شرافت کے مصنوعی ٹیگ سے بھی لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ وہ کسی کی بھلائی کے جواب میں شکریہ نہیں بلکہ "تھینک یو" کہتا ہے۔ وہ محبت اور ترس کے جذبات بھی انگریزی زبان میں ظاہر کرتا ہے۔ اسی لیے وہ "پور لٹل سول" کہہ کر بلی سے محبت اور شفقت کا اظہار کر رہا ہے۔ نوجوان مغربی موسیقی کے آلات کی دکان پر جاتا ہے تو وہاں بھی انگریز سے مرعوب ہے مگر تہذیب نو کا لبادہ اوڑھے نوجوان کی حقیقت مصنف نے یوں بیان کی ہے۔ "سرورق رنگ دار اور دھنیں گھٹیا" یہ جملہ بلاشبہ تہذیب نو سے بیزاری ہے۔ اس کا خول ایکسیڈنٹ کے بعد ہسپتال میں اس کے کپڑے اتارتے ہوئے ٹوٹتا ہے۔ اصل میں نوجوان ایک خوبصورت خول میں چھپ کر زندگی جینا چاہتا ہے ایسا خول جسے معاشرہ قبول کرتا ہے۔ مثلاً:

> "اوور کوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بوسیدہ اونی سوئٹر نکلا جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سوئٹر سے بھی بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینوں سے نہیں نہایا۔"(5)

غلام عباس کا افسانہ "اوور کوٹ" نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایسے نوجوان کی کہانی لئے ہوئے ہے جو طبقاتی کشمکش کا شکار ہے۔ زندگی بھر اعلی طبقے میں شامل ہونے کے خواب دیکھتا ہے وہ ایک ایسے طبقے کا نمائندہ ہے جسے زندگی بھر داد و عیش کے مواقع میسر نہیں آئے۔ جس کا انجام علم ناک ہے جو قاری کو حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے "اوور کوٹ" سماجی بہروپ اور خول کی علامت ہے۔ طبقاتی کشمکش میں مبتلا انسانی خواہشات کی ناآسودگی کے باعث اوور کوٹ تصنع، فریب اور تضاد کی علامت بھی بن جاتا ہے۔ شہزاد منظر کے نزدیک:

> "غلام عباس بنیادی طور پر حقیقت نگار تھے۔ اس لئے انھوں نے زندگی بھر حقیقت نگاری کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور معاشرے میں جو اچھائیاں اور برائیاں دیکھیں انھیں ہو بہو پیش کرنے پر اکتفا کیا۔"(6)

جزئیات نگاری کے کمال اور معمولی بات سے غیر معمولی کیفیت پیدا کرنے میں "اوور کوٹ" کا کوئی ثانی نہیں ہے قاری کو ایک لمحے کیلئے بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ "اوور کوٹ" میں ملبوس شخص فلاکت زدہ ہے۔ اس نے یہ اوور کوٹ اور گلوبند اس نے دنیا کو دھوکا دینے کیلئے پہنا ہوا ہے۔ اس کے نیچے ملمع کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایک حادثے کے باعث وہ ہسپتال پہنچتا ہے آپریشن کیلئے اس کا لباس اتارتے ہوئے اس کی حالت اور جیبوں سے برآمد ہونے والی اشیاء اس کی مفلوک الحالی آشکار کر دیتی ہیں

،اس کردار کا کوئی نام نہیں، یہ ہر اس شخص کی نمائندگی کرتا ہے جو معاشرے میں ملمع زدہ زندگی بسر کرتا ہے۔ افسانہ "اوور کوٹ" لکھنے کا خیال کیسے آیا اس حوالے سے غلام عباس کہتے ہیں:

"اوور کوٹ" کی کہانی کا خیال یوں سوجھا کہ دہلی میں ایک رات کو ہم ایک موٹر میں نظام الدین اولیا کو جانے والی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ مقصد محض تفریح اور گپ بازی تھا۔ کار پطرس بخاری چلا رہے تھے اور کار کے دوسرے مسافروں میں تاثیر، فیض، کرنل مجید ملک مرحوم اور خاکسار شامل تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ میں نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے پر سلک کا مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ یہ اوور کوٹ اور منظر بالکل ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا کہ نیچے میں نے صرف پھٹا ہوا بنیان اور پاجامہ پہن رکھا ہے۔ میں اپنے دوستوں کو جو مجھے بلانے کے لیے گھر پر آئے تھے، زیادہ دیر انتظار کرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے شب خوابی کے لباس پر اوور کوٹ اور مفکر پہن لیا تھا۔ موٹر چلی جارہی تھی اور شعر و شاعری پر دل چسپ بحث ہو رہی تھی کہ اتنے میں سڑک کے بیچوں بیچ ایک ٹرک کچھ زیادہ تیز رفتاری سے سامنے آگیا۔ اگر پطرس صاحب جلدی سے موٹر کو ایک طرف نہ کر لیتے تو ٹکر ہو جانے میں کوئی کسر نہ رہ جاتی۔ ہم لوگ بال بال بچ گئے۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے خیال آیا کہ فرض کرو اگر ٹکر ہو گئی ہوتی اور ہم سب مرے پڑے ہوتے یا زخمی، ہمیں ہسپتال میں پہنچایا جاتا تو دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران ہوتے کہ سب لوگ تو ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن ایک شخص نے عجیب حلیہ بنا رکھا ہے کہ اوپر سے قیمتی اوور کوٹ اور مفلر ہے اور اندر سے پھٹا ہوا بنیان اور پائجامہ ہے۔"(7)

افسانے میں کمال کی جزئیات نگاری اور منظر نگاری کی گئی ہے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے قاری کے سامنے ایک مکمل تصویر آجاتی ہے۔ افسانے کا آغاز یوں ہوتا ہے:"جنوری کی ایک شام ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیرنگ کراس کا رخ کر کے خراماں خراماں پٹری پر چلنے لگا یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ لمبی لمبی قلمیں، چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں۔ بادامی رنگ کا گرم اوور کوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا، سر پر سبز فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی، سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی مزے میں آگے گھمانے لگتا ہے۔"

نوجوان کی وضع قطع میں کمال ان جزئیات کا ہے جنھوں نے اس بے نام کردار کو ایک مکمل کردار بنا دیا ہے۔ زمان و مکان کے مختصر ذکر کے بعد مرکزی کردار کا تعارف اس انداز سے کرایا گیا ہے کہ دونوں آپس میں جڑ کر ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ سویا مانے یاسر کے نزدیک:

"اوور کوٹ" غلام عباس کے کرداروں کی جزئیات نگاری کی ایک کامیاب مثال ہے اس افسانے میں مرکزی کردار کے علاوہ دوسرے کرداروں کی جزئیات نگاری میں بھی فن کا کمال نظر آتا ہے۔"(8)

یہ منظر نگاری صرف جزئیات کا کمال نہیں بلکہ غلام عباس کے گہرے مشاہدے کا غماز ہے۔ دراصل جزئیات نگاری کے کمال میں واردات کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے غلام عباس خود کہتے ہیں یہ "خود مجھ پر ہی گزری ہوئی وارداتیں ہیں" مشاہدے کی اس باریک بینی نے ان کی کہانی میں حقیقت کا پہلو پیدا کر دیا ہے اور ان کی کہانی کو معاشرے کا ترجمان بنا دیا ہے۔

غلام عباس اپنے افسانوں میں موضوع سے ہٹ کر کوئی کہانی نہیں لکھتے۔ اپنی کہانیوں میں موثر و مدلل انداز سے سماج کے تلخ حقائق کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سماج کے دونوں طبقات میں سے ایک طبقہ جو غرباء کا خون چوس کر اس ظاہری چمک دمک میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے اور دوسرا طبقہ ان غریبوں کا ہے جو دنیا کی

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678

Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

چمک دمک کو امیروں تک پہنچانے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر دیتا ہے۔ غریب لوگ توریستوران کے باہر کھڑے ہو کر چند لمحوں کے لیے امیروں کے ذوق وشوق سے مسرور ہوتے ہیں۔ "اوور کوٹ "کا کر دار جو افسانے میں ایک امیر زادے کا کر دار ادا کر رہا ہے یہ کر دار اپنی عزت نفس کے مارے ان لوگوں کے ساتھ میوزک سننا پسند نہیں کرتا اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ مجسموں کی دُکان پر نوجوان برٹش حکومت کا بہت وفادار اور فرمان بر دار نظر آتا ہے اس کی وفاداری اس صورت میں سامنے آتی ہے کہ وہ ملکہ کے مجسمے کو بھی تعظیم اور توقیر دیتا ہے۔ وہ نوجوان جو پان والے کو تو نوکر کی طرح مخاطب کرتا ہے "اے پان والا" مگر ملکہ کے مجسمہ سے محبت کرتا ہے۔ مصنف اس بات سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ اب لاہور میں کبڈی یا گلی ڈنڈے کا دور نہیں اسی لیے تو بچے بھی کرکٹ یا فٹ بال کے کھیل میں مصروف ملتے ہیں۔ اُس عہد کے معاشرتی و معاشی طبقات نے نہ صرف امیر وغریب کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کی بلکہ انگریز اور ہندوستانی" کے نام سے انسانوں کو دو بڑے گرہوں میں منقسم بھی کر دیا۔ ہر جگہ انگریزی پوش اور انگریزی پسند لوگ مہذب اور باعلم مانے جاتے اور دیسی خدمت کرتے ہوئے اور حاکمین کی محافل کو رونق بخشتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اذہان میں تبدیلی اس قدر پیدا ہو چکی ہے کہ سردی سے ٹھٹھرتی بلی سے تو پیار کیا جاتا ہے مگر انسانوں کے لیے اُن میں محبت کا جذبہ فقط حاکم و محکوم جیسا ہی ہے۔

اگلے منظر میں یورپین موسیقی کی دکان میں وہ بلا تکلف قدم رکھتا ہے۔ یہ اس کا نفسیاتی رد عمل ہے۔ غلام عباس کے عہد میں تقسیم سے پہلے امیر وغریب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ "اوور کوٹ "کا قصہ بھی غلام عباس کے عہد کے سماجی نقطہ نظر کے اعتبار سے غیر حقیقی اور ناقابل یقین ہونے کے باعث مرکزی کر دار میں اکیسویں صدی کے نوجوانوں کی خصوصیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ جس وجہ سے افسانے کا یہ کر دار اپنے انوکھے پن کی وجہ سے قاری کی نگاہوں میں مانند پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً:

> "اس اثنا میں نوجوان جوڑا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا اس کے پاس سے گزر کر آگے
> نکل گیا۔ نوجوان کے لیے جواب ان کے پیچھے پیچھے آرہا تھا، یہ نظارہ خاصا جاذب نظر
> تھا۔ وہ جوڑا کچھ دیر تک تو خاموش چلتا رہا۔ اس کے بعد لڑکے نے کچھ کہا جس کے جواب
> میں لڑکی اچانک چمک کر بولی: ہر گز نہیں، ہر گز نہیں، ہر گز نہیں۔"
> سنو میرا کہنا مانو "لڑکے نے نصیحت کے انداز میں کہا۔ ڈاکٹر میرا دوست ہے کسی کو کانوں
> کان خبر نہ ہو گی۔"
> "نہیں نہیں نہیں"
> "میں کہتا ہوں تمہیں ذرا تکلیف نہ ہو گی۔"
> لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا
> "تمہارے ماں باپ کو کتنا رنج ہو گا۔ ذرا ان کی عزت کا بھی تو خیال کرو۔"
> چپ رہو چپ رہو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔"(9)

جوڑے کے اداکارانہ مکالموں سے نوجوان کر دار بے ساختہ متاثر ہوتا ہے حالانکہ ان مکالموں میں حقیقی زندگی کا جو رنگ جھلکتا ہے وہ قطعا مصنوعی اور ڈرامائی فضا سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ان مکالموں سے مرد اور عورت کے فطری و ازلی رشتے بے نقاب ہوتے ہیں مگر نوجوان ان دونوں کا تعاقب کرتے ہوئے ایک لاری کے حادثے کا شکار ہو جاتا ہے اور اسے ہسپتال پہنچایا جاتا ہے۔ جہاں اس کی اصلیت کھل کر سامنے آتی ہے۔

> "آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے
> جنہوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کا سارا حصہ چھپا رکھا تھا اس کی دیکھ بھال میں مصروف
> تھے اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔"(10)

مصنف نے علامتا ڈاکٹر اور نرسوں کے نقابوں سے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ انسان ایک دوسرے کی ظاہری صورت کو مکمل شخصیت کا آئینہ دار سمجھتا ہے مگر اس کی رسائی دوسرے انسان کی اصلیت تک کبھی نہیں ہوتی۔

کر دار نگاری اور جزئیات نگاری کے کمال میں ان کے اسلوب کا بڑا حصہ ہے بظاہر یہ ایک سادہ بیانیہ اسلوب ہے لیکن در حقیقت ایسا نہیں اس سادگی میں اعلیٰ درجہ کی فن کاری ہے۔ ان کے افسانے کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادگی ہے اور اس سادگی کا حسن ہی ان کے اسلوب کا مرہون منت ہے وہ رنگین عبارت لکھنے کی بجائے سادہ لفظوں

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678

Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

سے معنی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہوں نے کوئی تکنیکی تجربہ نہیں کیا لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں تکنیک کا ایک تنوع نظر آتا ہے۔ اس تنوع میں غلام عباس کا اسلوب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسلوب کی یہ روانی انہیں کہانی گڑھنے اور مخصوص تکنیک کے سانچے میں ڈھالنے کی شعوری کوشش سے بچالیتی ہے ان کے لکھنے کی یہ بے ساختگی دراصل ان کے اسلوب کی بے ساختگی ہے اس لئے بنیادی بات یہ ہے کہ وہ ایک تخلیقی ذہن رکھنے والے فنکار ہیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اسے فن بنا کر پیش کیا ہے ان کے افسانوں کی بنت میں وہ فنی جمالیات اور دائمی اقدار ہیں جس کی وجہ سے ان کی کئی کہانیاں آج بھی تروتازہ ہیں، اس تازگی کا بنیادی عنصر بے ساختگی ہے جو انہیں تصنع سے بچاتی ہے۔ افسانے کے بارے میں ان کی رائے ہے:

> "محض واقعات بیان کر دینے سے افسانہ نہیں بنتا۔ اس میں زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ایسا ہونا چاہئے، جو اتفاق سے آپ کو نظر آ گیا ہو لیکن لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا ہو۔۔۔۔ افسانہ صرف سوچ سوچ کر نہیں لکھا جا سکتا۔"(11)

مشاہدہ جب ایک تخلیقی عمل سے گزرتا ہے اور اس میں فنی قدریں شامل ہوتی ہیں تو غلام عباس کے افسانے وجود میں آتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کی لذت معمولی بات میں سے غیر معمولی پہلو تلاش کرنا ہے۔ یہی صورت ان کے کرداروں کی ہے وہ اگرچہ عام سے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے اندر کوئی ایسی غیر معمولی بات ہوتی ہے جو کہانی کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے ان کے افسانوں کی ایک خاص خوبی اختتام ہے وہ چونکا دینے والے اختتام کی بجائے غیر روائتی طریقے سے کہانی ختم کرتے ہیں لیکن اس طرح قاری دیر تک کہانی کی گرفت میں رہتا ہے۔ ان کی اکثر کہانیوں کی آخری سطریں قاری پر کہانی کی مقصدیت کو ایک حیرت کی صورت میں اس طرح نمایاں کرتی ہیں کہ سادہ سا اختتام بھی گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ مثلاً "اوورکوٹ" کے اختتام پر آخری جملہ "جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کر دیا۔" قاری کو حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ جملہ پوری انسانی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے یہ افسانہ درحقیقت طبقاتی معاشرے میں رہتے ہوئے ناآسودہ خواہشات کے باعث پیدا ہونے والی ظاہری اور باطنی کیفیت کی کہانی ہے مغربی تہذیب میں لپٹا ایک کردار جس کی ظاہری بناوٹ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی اس کا اختتام قاری کو حیران و ششدر کر دیتا ہے۔

"اوورکوٹ" بیسویں صدی کے نصف اول میں برصغیر کی سماجی صورت حال کے ساتھ ساتھ سماجی رسوم اور معاشی و معاشرتی تعصبات کی بھینٹ چڑھے نوجوانوں کے ذہن کی پکار بھی ہے۔ ایسا نوجوان جو انگریزی تہذیب سے مرعوب اور معاش و مفلسی کے ہاتھوں مغلوب بھی ہے۔ وہ نوجوان جو اپنی اصلیت کو نئی انگریزی تہذیب کے اوورکوٹ میں چھپائے حقیقت سے لڑ رہا ہے۔ آدھ کھلا پھول نوجوان طبقہ کی اُن ادھوری خواہشات کی عکاسی کرتا ہے جو وقت کی ستم ظریفی اور مفلسی کی سولی چڑھ جاتی ہیں۔ افسانہ "اوورکوٹ" کا مرکز وہ نوجوان ہے جو لباس و پوشاک کے اعتبار سے انگریزی دکھنا چاہتا ہے بلاشبہ انگریزی حکمران تعظیم و توقیر کے اعتبار سے ہندوستانیوں کے لیے متاثر کن طبقہ تھے۔ اسی لیے نوجوان اپنی تہذیب کو اپنانے کی بجائے عہد نو کے مطابق انگریزی لباس کو فوقیت دیتا ہے۔ وہ بید کی چھڑی سے حاکم کی طرح نظر آنا چاہتا ہے جو ہر طبقہ پر حکم چلانے کا حق رکھتا ہے اور چھڑی سے اقتدار کا لطف چاہتا ہے بلاشبہ چھڑی اس نوجوان کے مغرور اور اقتدار پسند ہونے کی علامت ہے جو احساس کمتری کے دور میں کمتری کے احساس میں مبتلا ہر شخص کی آرزو ہوتی ہے۔

نوجوان کا اوورکوٹ سے ایک ہاتھ باہر اور ایک ہاتھ اندر تہذیب کے اُس آمدی تحرک کا مظہر ہے جو چپکے چپکے منصوبہ بندی و حکمتِ عملی کے تحت مشرق کے باشندوں میں گھر کر چکی ہے۔ وہ تہذیب جو دروازے پر کھڑی قدیم ثقافت کو خیر باد کہتی ہوئی میدانِ دہر میں جگہ بنا رہی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کے نزدیک:

> "غلام عباس منافقت، ریاکاری اور بہروپ کو ناپسند کرتا ہے مگر وہ ایسا افسانہ نگار نہیں جو اپنی ناپسندیدگی کا اعلان چیخ چیخ کر کرے یا اس کا قلع قمع کرنے کا عزم با آواز بلند کرتا دکھائی دے وہ تو بس ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ہمارے تضادات ہمارے سامنے لا کر نیم لاتعلقی سے مسکرانے لگتا ہے اس مسکراہٹ پر طعن کا گمان بھی ہوتا ہے مگر اسے زہر خند کا نام نہیں دیا جا سکتا کہ یہ منٹو کے ساتھ مخصوص تھا۔ "اوورکوٹ" اور "بہروپیا" میں کرداروں سے نفرت نہیں دلائی گئی بلکہ یہ ملال انگیز احساس ابھرتا ہے کہ ایک کو سماجی دباؤنے اور دوسرے کو پیٹ کی مجبوری نے اپنا اصل روپ چھپانے پر مجبور کیا ہے۔"(12)

افسانہ کے اختتام میں نوجوان کا ہائی کورٹ کے سامنے دم توڑ جانا اور ہائی کورٹ کے سامنے کچل کر جانے والی گاڑی کا دسترس میں نہ آنا اُس دور کی منصفی اور عدلیہ پر سوالیہ نشان ثبت کرتا ہے اور معاشرے کا وہ گھناؤنا رنگ پیش کرتا ہے جو انصاف سے پاک عدل سے محفوظ اور جبر سے لیس ہے۔ یہ منظر معاشرے کی تلخی، بے حسی اور بے رحمی کو عیاں کرتا ہے۔ ستم در ستم یہ کیفیت کہ جب نوجوان مر گیا تو وہ جھوٹا غرور اور بانکپن جو بید کی چھڑی کی صورت میں تمام افسانہ میں اس کے ہمراہ رہا اختتام میں وہ نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ جاہ و حشمت اور رعب و جلال جو اقتدار اور اختیار کا مظہر ہے مرتے ہی ہاتھ سے جاتا رہا اور بید کی چھڑی چھوٹتے ہی بھید کھل گیا۔

غلام عباس کے یہاں تکرار نہیں بلکہ ہر کہانی ایک نئی دنیا کا منظر پیش کرتی ہے۔ انہیں خود بھی اس کا احساس تھا۔ یہ تنوع ہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ وہ ایک ایسے افسانہ نگار ہیں۔ جن کی کہانیاں ہر عہد میں اپنا قاری رکھتی ہیں۔ فن میں بھی وہ ایک کلاسیکی مزاج رکھتے تھے یعنی ادبی جمالیات کی پاسداری اور فنی گرفت، عصر حاضر کے ساتھ ساتھ ماورائے عصر پہلو کی تلاش، ان کا نقطہ نظر تھا، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے اسے سمجھنے کی ایک عمدہ کوشش کی ہے:

"ان کا نقطہ نظر کلاسیکی ہے اور وہ یہ کہ جب انسانی زندگی اپنے حدود کو تسلیم نہیں کرتی تو اعلیٰ قدریں، نیکیاں اور اعلیٰ معیارات بدی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں کلاسیکی نقطہ نظر اشیاء اور انسانوں کو حدود میں دیکھتا ہے جبکہ رومانی نقطہ نظر لا محدود کی تلاش کرتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو غلام عباس کو اپنے ہم عصر اور ترقی پسند افسانہ نگاروں سے ممیز کرتا ہے۔"(13)

دائرے میں وسعت تلاش کرنے کا یہ فن غلام عباس کو اردو افسانے میں ایک منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ غلام عباس زندگی کی بڑی حقیقتوں کا ترجمان ہے زندگی کی وسعت کو گرفت میں لینے کیلئے معمولی واقعات سے غیر معمولی اثرات پیدا کرنے کا سلیقہ رکھتے ہے ان کا بیانیہ سادہ اور ہموار ہونے کے ساتھ ساتھ داخلی قوت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور افسانے کی رگ و پے میں پوری طرح پیوست ہو جاتا ہے۔ غلام عباس کے افسانوں کی پیش کش میں موضوع کو خصوصی اہمیت حاصل ہے ان کے یہاں افسانے کے واقعات بعض اوقات سادہ ہی نہیں بے رنگ بھی نظر آتے ہیں لیکن افسانہ کے اختتام پر یہ بے رنگ واقعات مجموعی تاثر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جس سے افسانے کا آہنگ اور تسلسل برقرار رہتا ہے اور داخلی تاثر مدھم نہیں ہوتا۔ ظاہر کی بے رنگی میں رنگ پیدا کرنا اور سادگی میں پرکاری دکھانا بڑی فنی ریاضت کا تقاضا کرتے ہیں۔ غلام عباس کو یہ فن آتا تھا۔ وہ بظاہر سادہ لیکن بہت پر تاثر افسانے لکھتے ہیں۔

"اوور کوٹ" کو گوگول کے افسانے کا چربہ کہا جاتا ہے۔ گوگول کا "اوور کوٹ"، اصل میں روسی حقیقت نگاری کا ایک اہم سنگ میل ہے جو 1842ء میں سامنے آیا۔ یہ سرکاری ملازم اکاکی اکاکیوچ کی کہانی ہے، اس کی زندگی میں اوور کوٹ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اوور کوٹ اس کے لیے وقار اور تحفظ کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ المیہ اور طنز کی علامت بھی بن جاتا ہے۔ غلام عباس کا "اوور کوٹ" اگرچہ سطحی طور پر اسی مرکزی شے "اوور کوٹ" کے گرد گھومتا ہے، مگر اس کی معنویت، سیاق و سباق اور بیانیہ اسلوب گوگول سے بالکل مختلف ہے۔ اس حوالے سے خود غلام عباس کا کہنا ہے کہ:

"جب میں نے "اوور کوٹ" لکھا تو مجھے یاد تھا کہ روسی استاد گوگول کا بھی اسی نام سے ایک بے حد مشہور افسانہ ہے اسی طرح راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ "گرم کوٹ" کے نام سے میں پڑھ چکا تھا۔ میں نے اسے نہایت بے باکی اور جرات مندی سے لکھا۔ اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا تو اسے انعامات سے نوازا گیا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اگر عنوان یکساں ہو تو سرقہ کے ذیل میں نہیں آتا۔"(14)

غلام عباس کے افسانے کا مرکزی کردار مال روڈ پر ماڈرن انداز میں مٹرگشت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا اوور کوٹ اس کی ظاہری شخصیت اور خود ساختہ شناخت کا ذریعہ ہے۔ مگر اس کی ظاہری شناخت کے پیچھے غربت، محرومی اور طبقاتی تضاد چھپا ہے۔ اس کی جسمانی و روحانی برہنگی ایک سڑک حادثے کے بعد سامنے آتی ہے۔ گوگول کے افسانہ میں اکاکی کی روح ماورائی انجام کی طرف جاتے ہوئے اپنا بدلہ لیتی ہے، جب کہ غلام عباس کا افسانہ ایک ایسے المیہ پر ختم ہوتا ہے، جہاں مصنوعی شناخت نوجوان کی حقیقت کا پردہ فاش کر کے قاری کو چونکا دیتی ہے۔

غلام عباس نے اپنے افسانے میں جمالیاتی تاثر اور تہذیبی شعور کے ساتھ برصغیر کے شہری معاشرے، طبقاتی شعور، اور انسان کی دوہری زندگی کو نمایاں کیا ہے۔ ان کا نوجوان کردار گو کہ ظاہری طور پر فیشن ایبل ہے، مگر اس کا باطن نہایت شکستہ، کمزور اور محرومی کا شکار ہے۔ اس کردار کی پرتیں حادثے کے بعد ہسپتال میں اس کے قیمتی اوورکوٹ کے نیچے سے پرانے، بوسیدہ اور میلے لباس سے کھلتی ہیں۔ یہ لمحہ کہانی کا عروج ہے جہاں طبقاتی نظام اور سماجی دکھاوے کی شدید ترین نفی سامنے آتی ہے۔ غلام عباس کا افسانہ برصغیر کی طبقاتی اور تہذیبی پیچیدگیوں پر گہرا طنز ہے۔

حوالہ جات:

1. سویا مانے یاسر، غلام عباس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1995ء، ص:183
2. انور سدید، ڈاکٹر، مقدمہ "مختصر اردو افسانہ عہد بہ عہد"، مقبول اکیڈمی شاہراہ قائد اعظم، لاہور، 1992ء ص:38
3. انوار احمد، ڈاکٹر، "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ"، مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد، 2010ء، ص:347
4. ایضا، ص:352
5. غلام عباس، "جاڑے کی چاندنی"، ابلاغ پبلشرز، لاہور، 2004ء، ص:9
6. شہزاد منظر، "علامتی افسانے میں ابلاغ کا مسئلہ "منظر پبلی کیشنز، کراچی، 1990ء، ص:149
7. طاہر مسعود، ڈاکٹر، "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے"، اکادمی بازیافت، کراچی، 2007ء، ص:39
8. سویا مانے یاسر، "غلام عباس"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1995ء، ص:
9. غلام عباس، "جاڑے کی چاندنی"، ص:31
10. ایضا، ص:9
11. طاہر مسعود، ڈاکٹر، "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے"، ص:37،38
12. انوار احمد، ڈاکٹر، "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ"، ص:347
13. (غلام عباس....باتیں لاہور 1999)
14. طاہر مسعود، ڈاکٹر، "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے"، ص:41